© rasailojaraid.com

فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید

محرکات اور ضرورت

مجیب اللہ ندوی

سیمینار کے ذمے دار حضرات کی طرف سے جو دعوت نامہ بھیجا گیا ہے اس میں عنوان کے طور "فکر اسلامی کی تشکیل جدید" اور "علم کلام اور شریعت اسلامی کی نئی تعبیر" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور اس سلسلے میں جن شخصیتوں نے ایک ڈیڑھ صدی کے اندر کوششیں کی ہیں ان میں سے کچھ حضرات کے ناموں کی نشاندہی بھی کردی گئی ہے مثلاً مفتی محمد عبدہٗ سرسید احمد خان اور علامہ سرمحمد اقبال وغیرہ مگر ساتھ ہی اس حقیقت کا اظہار بھی کیا گیا ہے کہ ان کی کوششیں یا تو علما کی قدامت پرست ذہنیت کی وجہ سے بارآور نہ ہوسکیں یا لوگ ان کو سمجھ نہ سکے مفتی محمد عبدہ کے خیالات مصر کے قدامت پرستوں کی وجہ سے بارآور نہ ہوسکے اور سرسید کے تصورات ہندوستانی علما کی وجہ سے عام نہ ہوسکے حتیٰ کہ خود مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے فرزندوں نے بھی ان خیالات کو آگے بڑھانے کی کوشش نہیں کی اور ڈاکٹر سر محمد اقبال جیسے لوگوں کے خیالات اس لئے پروان نہیں چڑھ سکے کہ لوگ انہیں سمجھ نہیں سکے علما اس وجہ سے نہیں سمجھ سکے کہ وہ انگریزی زبان میں تھے اور وہ انگریزی زبان سے ناواقف تھے اور جدید تعلیم یافتہ حضرات کو اس کا موقع ہی نہ مل سکا کہ وہ اس کو سمجھنے کی کوشش کرتے اس وقت ہم اس پر بحث کرنا نہیں چاہتے کہ اول الذکر دونوں حضرات کے سامنے فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا مسئلہ کس حد تک تھا یہ بات قابل بحث ہے البتہ ڈاکٹر سر محمد اقبال نے اپنے خطبات میں "تشکیلِ جدید" کا لفظ ضرور استعمال کیا ہے۔ ہم آگے اس کی وضاحت کریں گے کہ اس کی حیثیت کیا تھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیکن اس کے ساتھ علامہ اقبال کے اوپر یہ زیادتی ہوگی اگر ہم انکی ان ستیزہ کاریوں کو نظر انداز کردیں جو انھوں نے مغربی ثقافت کے خلاف کی ہیں جس نے مسلم قوم میں خود اعتمادی کا ذہن پیدا کیا۔

بہرحال کسی وجہ سے جب عالم اسلام کی اتنی اتنی بڑی شخصیتوں کی سلسلے کی کوششیں بارآور نہ ہوسکیں تو ہم جیسوں کی رائے اس سلسلے میں کیا وزن رکھتی ہے مگر پھر بھی ان اسباب کو ہمیں ضرور تلاش کرنا چاہیے کہ یہ آواز بار بار اُٹھ کر کیوں دب جاتی ہے اس زمانے میں مولویوں کے "ذہنی تحجّر" اور موجودہ تعلیم یافتہ حضرات کی محدود علمی اور ذہنی سرگرمیوں کے باوجود اس کام کے لئے جو قدم اٹھایا گیا ہے اس کے لئے میں سیمینار کے منتظمین حضرات کو مبارک باد دیتا ہوں کہ انھوں نے اتنے بڑے کام کے لئے زمین ہموار کرنے کا کام نئے سرے سے شروع کردیا ہے۔

فکر اسلامی کی تشکیل جدید کی ضرورت ہے یا نہیں اگر ہے تو کس حد تک ہے اور اس کے حدود کیا ہونے چاہیں اور اگر نہیں ہے تو کیوں؟ اس پر چند صفحات کے بعد گفتگو کروں گا مگر میں آپ کے ذہن میں یہ بات ضرور ڈالنا چاہوں گا کہ ان اسباب کی تلاش کے ساتھ جن کی وجہ سے یہ آواز بار بار اُٹھ کر دب جاتی ہے ان محرکات کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے جن کی وجہ سے ڈیڑھ صدی کے اندر عالم اسلام میں اور خود ہندوستان میں بار بار یہ آواز سنائی دی اور متعدد شخصیتوں نے اسلامی قانون اور اسلامی تاریخ کی تدوین جدید علم کلام کی نئی تعبیر اور جدید تہذیب کی روشنی میں اسلامی افکار و تصورات پر نظر ثانی وغیرہ وغیرہ ناموں سے اپنے تصورات کو ایک تحریک بنانے کی کوشش کی مگر ان کو اسمیں کامیابی نہیں ہوئی۔ راقم الحروف کے نزدیک ان محرکات ہی سے ان اسباب کا بھی پتا چل جائے گا جن کی وجہ سے یہ کوششیں کامیاب نہیں ہوئی ان کی ناکامی کے اسباب جیسا کہ صوتنامے میں ظاہر کیا گیا ہے خارجی نہیں بلکہ داخلی ہیں اس سے میری مراد ان اصلاحی اور تجدیدی تحریکات سے نہیں ہے جو اس وقت مختلف ملکوں میں دین کی کوئی فکری تشکیل نہیں بلکہ عملی تجدید اور اصلاح کی کوشش کر رہی ہیں مثلاً نہضۃ العلما الاخوان المسلمون، جماعت اسلامی یا تبلیغی جماعت وغیرہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید یا علم کلام اور شریعت اسلامی کی نئی تعبیر وغیرہ کی آواز جو بار بار اٹھتی رہتی ہے راقم الحروف کے نزدیک اس کے محرکات چار معلوم ہوتے ہیں اور وہ یہ ہیں مرعوبیت، ترقی پسندی برسرِ اقتدار طبقے کا دباؤ اور اباحیت پسندی۔ ان محرکات کا ذکر کرتے ہوئے لوگوں نے ان محرکات کے تحت اسلام کی نئی تعبیر کو کس حد تک صحیح سمجھا ہے اس کا مختصراً ذکر بھی کرتا چلوں گا اور ساتھ ہی ساتھ ان شخصیتوں کا بہت ہی اختصار کے ساتھ ذکر ہوگا جو ان محرکات کے آگے سپر انداز نہیں ہوئیں۔

مرعوبیت

اسلام کی تشکیلِ نو اور اس کو ایک ماڈرن نظامِ زندگی بنانے میں سب سے پہلا محرک راقم الحروف کے نزدیک مغربی تہذیب اور اس کے جدید علوم و فنون اور فلسفہ و سائنس سے وہ مرعوبیت ہے جس نے ایک نئے دین کی حیثیت اختیار کر لی ہے مرعوبیت سے مراد یہ ہے کہ مغربی علوم و سائنس کے حاملین نے کائنات کے آغاز و انجام کی جو توجیہ کی، انسانی وجود کے بارے میں انہوں نے جو نقطۂ نظر قائم کیا" اسلامی عقائد اور اسلامی مسائل سے متعلق جو تشکیکات پیدا کیں یا انھیں عقل کے خلاف ثابت کرنے کی کوشش کی، ان تحقیقات یا مشاہدات کو حقائق اور اصول مسلّمہ سمجھ کر ان کو قبول کر لیا جائے اور پھر دینی عقائد اور اسلامی مسائل کی تنقیح شروع کر دی جائے۔ مرعوب ہونے والوں میں کئی طرح کے لوگ تھے ایک تو وہ لوگ تھے جن کو اسلام سے کوئی شعوری تعلق نہیں تھا انھوں نے تو پہلے دن ہی سے اسلام کے لبادے کو اپنے اوپر بوجھ سمجھ کر اسے اتار پھینکا ایک گروہ ایسا تھا جس کو اسلام سے شعوری یا گہرا روایتی تعلق تھا ان لوگوں نے نئے مسائل کی روشنی میں اسلامی مسائل کی توجیہ و تاویل کی مستشرقین کی طرف سے جو اعتراضات کیئے گئے تھے اس کے جواب دیے اور اسلام کی برتری ثابت کرنے کی کوشش کی مثلاً علامہ شبلی نعمانی اور مولوی چراغ علی وغیرہ انھیں میں کچھ ایسے بھی ہوئے ہیں جنھوں نے مغربی تہذیب اور اس کے پیدا کردہ علوم نے مذہبی روایات اور حقائق کے بارے میں جو شکوک پیدا کیئے تھے یا خود ان حضرات کو جو اسلامی مسائل عقل کے خلاف نظر آتے تھے ان کی معذرت خواہانہ توجیہ کی یا انھوں نے اسلامی عقائد و احکام کو ایسے معانی پہنائے جو اسلام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے صریح اور مسلم اصولوں سے ٹکراتے تھے مثلاً سرسید احمد خان اور ان کے بعض رفقاء ان مرعوب ہونے والوں میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی تھی جن کی مرعوبیت نے ان کو احساس کمتری میں مبتلا کر دیا، اور وہ آخر وقت تک اس میں گرفتار رہے۔ (سرسید نے مسلمانان ہند کی جو خدمات کی ہیں وہ آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں مگر اسلامی مسائل اور اور معجزات وغیرہ کی تشریح کے سلسلے میں ان سے بڑی فاش غلطیاں ہوئی ہیں میرا اشارہ انہی کی طرف ہے)۔

اوپر میں نے مرعوب ہونے والوں کی جتنی قسمیں بیان کی ہیں وہ تمام قسمیں آج تک موجود ہیں مگر ان کا انداز اسلامی مسائل کے سلسلے میں اب معذرت خواہانہ کم جارہانہ زیادہ ہو گیا ہے یہ ضرور ہے کہ بیسویں صدی کے شروع میں کچھ ایسی شخصیتیں پیدا ہوگئیں جو اپنے مومنانہ عزم و بصیرت کے بنا پر نہ تو مرعوب ہوئیں اور نہ احساس کمتری کا شکار ہوتیں اور کوئی منفی پوزیشن اختیار کرنے کے بجائے مثبت رویہ اختیار کیا ان میں بھی دو گروہ تھے ایک گروہ تو ماضی کے اس ورثے کی حفاظت میں لگ گیا جو ان کو اپنے اسلاف سے ملا تھا آج دین کی جو اصلی صورت نظر آرہی ہے انہیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے ان کے بارے میں یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ جمود کی چٹان بن کر بیٹھ گئے مگر ان کی کوششیں ناقابلِ فراموش ہیں ان کے مقابلے میں ان کے مقابلے میں دوسرا گروہ تھا جس نے اس نئے دین کی بے حقیقی اور اس کے کھوکھلے پن کو دکھا کر اس کے مقابلے میں اسلام کو ایک مکمل نظام زندگی کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کی، اسلامی عقائد کی صاف ستھری تعبیر کی اور موجودہ مادی ذہن کے مطابق اس کی روحانی اور مادی قدرتوں کی توضیح کی ان میں سرفہرست نام سید رشید رضا مصری، مولانا سید سلیمان ندوی، علامہ اقبال جسٹس امیر علی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور مولانا مودودی کا ہے۔ علامہ اقبال نے اپنی پیغمبرانہ شاعری کے ذریعے اور جسٹس امیر علی اور سید صاحب نے اپنی سنجیدہ اور مدلل علمی تحریروں کے ذریعے اور مولانا مودودی نے اپنی سحر آفریں نثر نگاری کی وجہ سے مسلمان قوم کے اندر ایک خود اعتمادی اور مقابلے کی صلاحیت پیدا کر دی۔ عالم اسلام کی دوسری شخصیتوں اور ان کی خدمات کا ذکر آگے آتا ہے جسٹس امیر علی نے بعض اسلامی مسائل کے سمجھنے یا ان کی تعبیر میں سخت ٹھوکریں کھائی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں مگر یورپ میں اسلام کا تعارف ان کا ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔

۴۔ ترقی پسندی

فکر اسلامی کی تشکیل جدید، علم کلام اور شریعت اسلامی کی نئی تعبیر کا خیال جو بار بار کچھ حضرات کو پریشان کرتا رہتا ہے اس کا دوسرا محرک وہ ترقی پسندی ہے جو مغربی تہذیب اور علم فلسفہ کے نتیجہ میں پیدا ہوئی انقلاب فرانس کے بعد سے ایک زمانہ تھا کہ عام زبانوں پر جمہوریت کا نعرہ تھا اس زمانے میں اسلام کو جمہوریت کے مطابق بنانے اس کو جمہوری مذہب ثابت کرنے کی بڑے زور شور سے کوشش ہوئیں آج سے چالیس پچاس برس پہلے کے لٹریچر میں اس کا بہت ذکر ملے گا مگر انقلاب روس کے بعد سے ہمارے جدید تعلیم یافتہ اور کچھ مولوی طبقے کے سیاسی لوگ اشتراکیت اور اسلام میں توافق ڈھونڈنے لگے یا پھر یہ مشورہ دینے لگے کہ اسلام کو موجودہ ترقی پسند دور کا ساتھ دینا چاہیئے یہ تحریک صرف ہندوستان میں نہیں بلکہ پورے عالم اسلام میں پھیلی مگر چونکہ ہمارے پیش نظر اس وقت ہندوستان اور پاکستان ہے اس لئے میں وہاں کی دو تین عبقری شخصیتوں کو بطور مثال پیش کروں گا جنھوں نے اس تحریک کو اسلام کے خلاف ایک سازش سمجھا اس سلسلے میں بھی علامہ اقبال سید سلیمان ندوی، مولانا مودودی کا نام لوں گا کہ انہوں نے اسلام کو خود ایک ترقی یافتہ نظام زندگی کے طور پر پیش کیا اور مغربی تہذیب کی ساری افسوں طرازی کا تار پود بکھیر کر رکھ دیا علامہ اقبال کی نثری تحریروں کے کچھ اقتباسات یہاں نقل کیئے جاتے ہیں سید سلیمان ندوی اور مولانا مودودی کے اقتباس نقل کرنے کی ضرورت اس لئے نہیں کہ انہوں نے ہزاروں ہزار صفحات لکھے ہیں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایک زمانے میں اس سلطانی جمہور سے اقبال تو کچھ متاثر بھی ہوتے نظر آتے ہیں مگر مؤخر الذکر دونوں شخصیتیں ایک آن بھی اس سے متاثر نہیں ہوئیں۔

علامہ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے جو پیغام دیا ہے اسے نظر انداز کرتے ہوئے ان خطبات کا تھوڑا سا اقتباس نقل کیا جاتا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ عصر حاضر کی ذہنی سرگرمیوں سے جو نتائج مرتب ہوئے ان کے زیر اثر انسان کی روح مردہ ہو چکی ہے یعنی وہ اپنے ضمیر اور باطن سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہاتھ دھو بیٹھا ہے خیالات اور تصورات کی جہت سے دیکھئے تو اس کا وجود خود اپنی ذات سے متصادم ہے سیاسی اعتبار سے نظر ڈالیے تو افراد سے دست بہ گریبان ہے اس میں اتنی سکت ہی نہیں کہ اپنی بے رحم انانیت اور ناقابل تسکین جوع زر پر قابو حاصل کر سکے یہ باتیں ہیں جن کے زیر اثر زندگی کے اعلیٰ مراتب کے لئے اس کی جدوجہد بتدریج ختم ہو رہی ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہ درحقیقت زندگی ہی سے اُکتا چکا ہے اس کی نظر حقائق پر ہے یعنی اس کے اس سرچشمے پر جو اس کی آنکھوں کے سامنے ہے لہٰذا اس کا تعلق اپنے اعماق وجود سے منقطع ہو چکا ہے اور پھر جیسا کہ ہکسلے کو بھی خدشہ تھا جس کا وہ بہ تاسف اظہار بھی کر چکا ہے کہ مادیت کی اس باقاعدہ نشو و نما نے اس کے رگ و پے بھی مفلوج کر دیے ہیں کچھ ایسی ہی حالت مشرق کی بھی ہے۔

عصر حاضر کی لادینی اشتراکیت کا مطمح نظر بے شک نسبتاً زیادہ وسیع ہے اور اس کے جوش و سرگرمی کا بھی وہی عالم ہے جو کسی نئے مذہب کا ہوتا ہے لیکن اس کی اساس چونکہ ہیگل کے انتہا پسند متبعین پر ہے لہٰذا وہ اس چیز ہی سے برسرِ پیکار ہے جو اس کے لئے زندگی اور طاقت کا سرچشمہ بن سکتی تھی بہر حال یہ وطنیت ہو یا لادینی اشتراکیت دونوں مجبور ہیں کہ اس کے پیشِ نظر ہر کسی کو نفرت، بدگمانی اور غم و غصے پر اکسائیں حالاں کہ اس طرح انسان کا باطن اور ضمیر اور مردہ ہو جاتا ہے اور وہ اس قابل نہیں رہتا کہ اپنی روحانی طاقت اور قوت کے مخفی سرچشمے تک پہنچ سکے جب تک انسان کو اپنے آغاز و انجام کی کوئی نئی جھلک نظر نہیں آتی وہ کبھی اس معاشرے پر غالب نہیں آسکتا جس میں باہم دیگر مقابلے اور مسابقت نے ایک بڑی غیر انسانی شکل اختیار کر رکھی ہے نہ اس تہذیب و تمدن پر جس کی روحانی وحدت اس کی مذہبی اور سیاسی قدروں کے اندرونی تصادم سے پارہ پارہ ہو چکی ہے"۔

میں سمجھتا ہوں کہ جسے آج "جدید ذہن" کہا جاتا ہے اقبال ان سب سے زیادہ جدید الذہن تھے اور مغربی تہذیب اور علم اور فلسفے سے ان کی معلومات سکنڈ ہینڈ نہیں بلکہ براہِ راست تھی انھوں نے اسلامی مسائل پر سوچنے کا جو انداز اختیار کیا ہے اس سے کسی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو مشکل ہی سے اختلاف ہو سکتا ہے ممکن ہے کہ ذہن میں یہ بات کھٹک پیدا کرے کہ انہوں نے اپنے خطبات "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" میں جو ایک خاکہ دیا ہے، اور اس میں بعض حقائق کی جو تعبیر کی ہے وہ اُمت مسلمہ کے بہت سے اجتماعی مسائل سے کہیں کہیں ٹکراتی ہے تو یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ وہ خطبات ان کا آخری فکری سرمایہ نہیں تھے چنانچہ ان خطبات کے بعد ان کی جو خط و کتابت علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا مسعود عالم صاحب ندوی اور بعض دوسرے علماء سے ہوئی ہے اس سے ان کی اس سلسلے کی فکری تشنگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور خود ان کی پوری شاعری سے بھی اس کی تردید ہوتی ہے غرض یہ ہے کہ اس دوسرے محرک کے تحت اسلامی تشکیل جدید کی جو آواز سنائی دیتی ہے اس کی حیثیت اقبال کی زبان میں یہ ہے ۔

لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید　　مشرق میں ہے تقلید فرنگی کا بہانہ

اور یہی سبب اس کی ناکامی کا ہے اس کی ناکامی کا سبب خارجی کم اور داخلی زیادہ ہے

۳ ــ برسر اقتدار طبقے کا دباؤ

راقم الحروف کے نزدیک اس کا تیسرا محرک برسر اقتدار طبقے کا دباؤ ہے یعنی برسرِ اقتدار طبقے کے سوچنے کا جو انداز ہو جاتا ہے یا ملک کے لئے جو سیاسی و معاشی سٹ اپ وہ چاہتا ہے اس کے مطابق وہ پورے ملک کو لے جانا ضروری سمجھتا ہے اسلامی ملکوں میں عام طور پر اس کے سوچنے کا انداز اوریجنل نہیں ہوتا بلکہ وہ کسی رائج مغربی یا مشرقی فلسفے اور اس کے فکر کو بنیاد بنا کر اس کے مطابق ایک نئے نظام کی تشکیل کرنا چاہتا ہے اِلّا ماشاءاللہ موجودہ علمی دور میں دباؤ کا "بزن" والا طریقہ اب کم اختیار کیا جاتا ہے بلکہ سب سے پہلے علم و فن کے ذریعے فکر و ذہن میں تشکیک پیدا کی جاتی ہے پھر ان اخلاقی و روحانی قدروں کی بے قدری کی جاتی ہے جو اس سٹ اپ سے میل نہیں کھاتیں یا پھر انہیں ایک اضافی چیز بنا دیا جاتا ہے ۔ ملک کی ترقی اور معاشی خوش حالی کے نام سے جو پروگرام بنائے جاتے ہیں انھیں اتنا ضروری بنا کر پیش کیا جاتا ہے کہ اگر خدا نخواستہ یہ پروگرام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پورا نہ ہوا تو پھر ملک صدیوں پیچھے چلا جائے گا اور انسانیت تباہ ہو جائے گی اس کے لیئے مختلف افراد اور اداروں کو استعمال کیا جاتا ہے نئے ادارے قائم کیئے جاتے ہیں مثال کے لیئے حال کی شائع شدہ کتاب "مذہب اور جدید ذہن"[1] کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے مصنف پاکستان میں اسلامی دستور سازی کی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ قیام پاکستان کے فوراً بعد کسی بھی قابل ذکر طبقے میں عوام کے خوف سے اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ کھل کر شریعت اسلامیہ کے نفاذ کی مخالفت کرتا لیکن درحقیقت وہ گروہ جس کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ ڈور تھی ذہنی اعتبار سے پاکستان کے مذہبی طبقے کے ساتھ ایک قدم بھی نہیں چل سکتا تھا۔ پاکستان اس وقت اس دور سے گذر رہا تھا جس سے مصطفیٰ کمال کے زمانے کا ترکی بھی گزرا تھا۔ انیسویں صدی کے ختم اور بیسویں کے آغاز میں ترکی دستور سازی کی اس کش مکش سے گزر رہا تھا جہاں اس کا ماضی اسلامی روایات سے بندھا ہوا تھا لیکن مستقبل کی طرف اُٹھنے والا ہر قدم مغرب کی طرف اُٹھ رہا تھا آخر کار اندرونی حالات کی بنا پر مصطفیٰ کمال کو یہ موقع حاصل ہو گیا کہ انہوں نے ترکی کو ماضی سے اپنا رشتہ توڑنے پر مجبور کر دیا پاکستانی قیادت کو یہ موقع حاصل نہیں تھا کہ وہ علی الاعلان شریعت اسلامیہ کو نظر انداز کر دیتی لیکن چونکہ اس وقت پاکستانی قیادت کا مطمح نظر ایک ماڈرن اور سکولر حکومت کا قیام تھا ساتھ ہی ساتھ وہ رائے عامہ کی مخالفت بھی مول لینا نہیں چاہتی تھی اس لیئے انہوں نے اجتہادی نام پر شریعت میں تاویل کرنے کا حق حاصل کرنے کی کوشش کی جب ایک بار یہ بات سامنے آگئی کہ تاویل کا حق ریاست کو حاصل ہے تو پھر ایک ایسی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی جانے لگی جس میں عوام کو یہ بات سمجھائی جا سکے کہ دین اور شریعت دو الگ الگ حقیقتیں ہیں ... دین کا تعلق روح و قلب سے ہے اور شریعت کی حیثیت کتاب وسنت کی روشنی میں بنائے ہوئے انسانی قوانین کی سی ہے دین ایک ایسی ازلی وابدی حقیقت ہے جس میں کبھی بھی رد و بدل نہیں ہو سکتا اس کے برخلاف شریعت

---

[1] از ڈاکٹر مشیر الحق مطبوعہ مکتبہ جامعہ نئی دہلی ص ۹۱،۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تشریح وتاویل کی محتاج ہے رائے عامہ کو استوار کرنے کے لیے اس موضوع پر دھڑا دھڑ کتابیں اور مضامین لکھے جانے لگے کراچی لاہور اور ڈھاکہ میں حکومت کی مدد سے تحقیقاتی ادارے قائم کیے گئے تاکہ وہ اس خیال کو زیادہ سے زیادہ عام کر سکیں ۱۹۵۰ء میں اس وقت کے پاکستانی گورنر جنرل مرحوم غلام محمد کی مدد اور ایما سے مرحوم خلیفہ عبدالحکیم نے لاہور میں ادارہ ثقافت اسلامیہ کی بنیاد ڈالی اس ادارے کے ایک (انگریزی) تعارف نامے میں ادارے کے قیام کا مقصد حسب ذیل الفاظ میں پیش کیا گیا۔

"اس ادارے کے قیام کا بنیادی مقصد اسلامی خیالات ورجحانات کو دنیا کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق کرنا ہے ادارے کے مقاصد میں یہ بات شامل ہے کہ اسلام کا ایک وسیع ترقی پسندانہ اور عقلی نقطۂ نظر دنیا کے سامنے پیش کیا جائے اور اس بات کا حل تلاش کیا جائے کہ اسلام کی روحانی بنیادوں کو نقصان پہنچائے بغیر اسے کس طرح تیزی سے بدلتی ہوئی مادی اور تکنیکی تبدیلیوں کے مطابق کیا جا سکتا ہے"

۴۔ اباحیت پسندی

اباحیت پسند ذہن ہر زمانے میں رہا ہے مگر اس جدید تہذیب نے اباحیت پسندی کو ایک فلسفہ بنا دیا جس میں "ہر گنہ ثواب ہے آج" کے تحت پورے انسانی معاشرے کی تربیت کی جا رہی ہے اس میں ہر برائی کے لیے ایک قانونی جواز پیدا کیا جا رہا ہے جس سے مسلم معاشرے کے بھی بے شمار افراد متاثر ہیں اور کچھ لوگ فطری طور پر ایسے واقع ہوئے ہیں ظاہر ہے کہ اسلام نے زندگی کے ہر گوشے میں حلال وحرام کی جو مضبوط حدیں قائم کر دی ہیں ایسا ذہن رکھنے والوں کے لیے یہ پابندیاں وحشت ناک معلوم ہوتی ہیں اس لیے وہ اس سے نجات پانے کے لیے مختلف تدبیریں اختیار کرتے ہیں کبھی وہ ترقی پسندی کا آڑ لیتے ہیں کبھی فقہی مسائل میں آئمہ اور فقہا کے اختلافات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں اور کبھی وقتوں اور مجبوریوں کی دہائی دیتے ہیں۔ ایک امریکی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عالم طبیعات نے اپنی کتاب دی ایوڈنس آف گاڈ میں بہت صحیح کہا ہے کہ "لوگوں کے دلوں میں یہ شبہہ چھپا ہوا ہے کہ خدا کے ملنے کے بعد ان کی آزادی کا خاتمہ ہو جائے گا جو لوگ آزادی کو دل و جان سے پسند کرتے ہیں آزادی کی محدودیت کا کوئی تصور ان کے لیئے وحشت ناک ہے۔"

بالکل یہی ذہن مسلمان اباحیت پسند حضرات کا ہوتا ہے وہ کسی محدودیت کو پسند نہیں کرتے اور کہیں سے محدودیت و پابندی کے خلاف کوئی آواز سنائی دیتی ہے تو وہ اس کے لئے کچھ شرعی دلائل فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اَب تک میں نے اس مسئلے پر منفی پہلو سے گفتگو کی ہے اور اس کی ضرورت اس لیئے تھی کہ اگر ہم ان محرکات کے تحت اسلامی مسائل پر گفتگو کریں گے تو ہم کسی نتیجے پر پہنچ سکے اور نہ عام مسلمانوں کے لیئے یہ چیز قابلِ قبول ہوگی پھر اس کی ضرورت اس لیئے بھی تھی کہ جب تک مسلمانوں کے مختلف طبقات کے رجحانات کو سمجھ نہ لیا جائے اس وقت تک مثبت پہلو کا پورا پورا فائدہ نہیں اٹھایا سکتا میرے نزدیک یہی اسباب ہیں جن کی بنا پر اب تک کی کوششیں کامیاب نہیں ہوسکی ہیں۔ میں عرض کرچکا ہوں کہ فکر اسلامی کی تشکیل جدید کی تحریکات کی ناکامی کے اسباب خارجی نہیں بلکہ داخلی ہیں یعنی اس کی ناکامی علما کی قدامت پرستی کیوجہ سے نہیں ہے بلکہ اس کی داخلی کمزوریاں ان کو ناکام بناتی رہی ہیں۔

عِلم کلام کی نئی تعبیر

اَب آیئے ہم مل کر مثبت طور پر سوچیں کہ واقعی موجودہ حالات کے لحاظ سے عِلم کلام اور شریعت اسلامی کی نئی تعبیر کی ضرورت ہے تو کس حد تک ہے اور نہیں ہے تو کس حد تک نہیں ہے دعوت نامے میں علم کلام اور شریعتِ اسلامی کی نئی تعبیر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اگر ذمے دار حضرات مجھے اجازت دیں تو میں اس عنوان کو "عِلم کلام کی نئی تعبیر اور شریعتِ اسلامی میں اجتہاد کی ضرورت" کے الفاظ سے بدل دوں تو مفہوم شاید زیادہ واضح ہو جائے گا اس لیئے کہ علم کلام میں جن مسائل سے بحث ہوتی اِن میں اجتہاد کا دخل نہیں ہوتا اور شریعتِ اسلامی یعنی عملی زندگی کے مسائل میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں اجتہاد کی گنجائش ہوتی ہے اس لیئے اس کے لیئے یہ لفظ زیادہ موزون ہے، ہمیں اُمید ہے کہ داعی حضرات کو اس سے کوئی اختلاف نہ ہوگا عام طور علم کلام کا موضوع بحث وہ مسائل ہوتے ہیں جو عام انسانوں کی عقل کی گرفت سے بالاتر ہوتے ہیں دوسرے الفاظ میں اس میں زیادہ تر ان اسلامی عقائد سے بحث ہوتی ہے جن کا تعلق غیب سے ہوتا ہے، یعنی ان میں ہم کو اپنے مشاہدے کے بجائے انبیاء کے مشاہدے پر اعتماد کرنا پڑتا ہے مثلاً توحید، آخرت، جنت، دوزخ اور ملائکہ اور اسی طرح مغیبات جن کا تعلق ایمانیات سے ہے اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور میں علم کلام کوئی الگ فن نہیں تھا۔ بلکہ قرآن نے اِن حقائق کو ذہن نشین کے لیئے جو فطری اور مشاہداتی دلائل بیان کئے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وحی کے ذریعے ان کی جو تشریح فرماتے تھے وہ ان مسائل کو ذہن نشین کرنے کے لیئے کافی ہوتے تھے گویا اس وقت کا علم کلام یہی تھا، مگر عہد نبوی کے بعد جب روم، ایران، مصر، شام اور ہندوستان کے علاقے مسلمانوں کی مملکت میں شامل ہوئے تو اسلام کی سادہ تہذیب کو بہت سی دوسری ایسی تہذیبوں سے سابقہ پڑا جن میں سے ہر ایک کی اپنی ایک زبان ایک تمدن اور ایک تہذیب اور فلسفہ تھا ایک طرف رومی علاقے کے ذریعے یونانی علوم مسلمانوں تک پہونچے تو دوسری طرف ایران کے ذریعے زرتشتی فلسفہ سامنے آیا اور مصر و شام کے ذریعے سریانی و حمیری زبان اور اس کے علوم اسلامی ممالک میں پھیلے اسی طرح سندھ کے واسطے سے ہندوستان اور اس کے فلسفے سے مسلمان روشناس ہوئے غرض یہ کہ نصف صدی کے اندر پورے اسلامی ملکوں میں بے شمار زبانوں، تہذیبوں، اور مذہبوں سے مسلمانوں کو سابقہ پڑا ظاہری طور پر ان کے حاملین نے اپنا مذہب بدل لیا تھا مگر جس زبان، جس تہذیب اور جس مشرکانہ فلسفے پر ان کی ذہنی تربیت ہوئی تھی وہ آسانی سے نہیں بدلی جاسکتی تھی اس لیئے فطری طور پر اسلامی عقائد سے مشرکانہ عقائد کا ٹکراؤ ہوا اور اس میں ہر طرح کا قیل وقال شروع ہوا ذات و صفات کے مسئلے پیدا ہوئے روح و ملائکہ اور بعثت بعد الموت پر گفتگو شروع ہوئی اس طرح متعدد فرقوں کی بنیاد پڑ گئی تاریخ اسلام میں اِن فرقوں کا نام اس لیئے آتا ہے کہ انھوں نے اسلامی عقائد میں فلسفیانہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

موشگافیانہ کیں اس وقت کی عام مجلسوں کا حال کیا تھا اس کو مشہور لغوی اصمعی زبان سے سنیئے۔

"جب کسی مجلس میں شرک کی باتیں ہوتی ہیں توآلِ برمک[1] کے چہرے کھل جاتے ہیں اور جب قرآن کی تلاوت کی جاتی ہے تو یہ مزدک کی باتیں شروع کر دیتے ہیں"
اسلامی عقائد میں بحث و مباحثہ بھی انھیں برامکہ کا فیض ہے مسعودی نے لکھا ہے یحییٰ بن خالد برمکی صاحب بحث و نظر تھا اس کی مجلس میں مسلمان متکلمین (یعنی معتزلہ) اور غیر مسلموں کا مجمع رہا کرتا تھا[2]

چنانچہ علماء کے ایک گروہ نے کتاب وسنت سے ان کا جواب دیا ان کے مزعومات پر ضرب لگائی اور اسلامی عقائد کی حقانیت خود ان کے فلسفے اور ان کے علوم کی روشنی میں دکھانے کی کوشش کی اس طرح گویا ایک فلسفیانہ علم کلام کی بنیاد پڑی متکلمین کے بڑے طبقے نے تو یہی روش اختیار کی مگر امت میں بے شمار افراد ایسے بھی ہوئے ہیں جنھوں نے اس نئے علم کلام کے بجائے اُسی قرآنی علم کلام کو سامنے رکھ کر حالات کے لحاظ سے اس کی نئی تعبیر کی چنانچہ دوسری صدی ہجری کے شروع میں امام حنیفہ نے الفقہ الاکبر لکھی جو حقیقتاً ایک عقیدہ کی کتاب ہے جس میں اسلامی عقائد کو صاف ستھرے انداز میں ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے، اسلامی تاریخ میں معتزلہ کا نام ہم بار بار پڑھتے ہیں حقیقتاً یہ متکلمین اسلام کا ایک گروہ تھا۔

ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں کہ علم کلام میں ان مسائل سے بحث ہوتی ہے جو انسانی اجتہاد کی گرفت سے بالاتر ہوتے ہیں مگر انھیں فلسفیانہ موشگافیوں کیوجہ بعض چیزوں کو

---

[1] برمک ایک ایرانی النسل آتش پرست خاندان تھا جس نے بظاہر اسلام قبول کر لیا تھا اور عباسی حکومت کے ابتدائی دور میں ان کو اتنا غلبہ ہو گیا تھا کہ حکومت کے سارے دردبست پر وہ قابض ہو گئے ہارون رشید نے سب سے پہلے ان کا سیاسی زور ختم ہو گیا۔
[2] یحییٰ بن خالد عباسی حکومت میں وزیر تھا اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس مباحثہ کا دائرہ کہاں تک وسیع تھا اسکے ساتھ اس سے مسلمانوں کی وسعت نظری کا پتہ بھی چلتا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حالات کے لحاظ سے علماء نے اپنے اجتہاد سے بعد میں عقائد میں داخل کیا مثلاً جب یہ پیدا ہوا کہ اللہ کی صفات اسکی ذات سے جُدا کوئی چیز ہے یا عین ذات ہے اور اسکی صفات قدیم ہیں یا حادث تو معتزلہ نے اللہ کی ذاتُ صفات کو علیحدہ علیحدہ حیثیت دی اور انھوں نے صفات الٰہی کو حادث قرار دیا اور اسی سے خلق قرآن کا مسئلہ پیدا ہوا جو مامون اور معتصم باللہ کے زمانے میں عالم اسلامی کا سب سے اہم مسئلہ بن گیا تھا اس کا سبب مورخین یہ بیان کرتے ہیں کہ مامون کے دربار میں ایک عیسائی نے دعویٰ کیا کہ حضرت عیسیٰ السلام کو چوں کہ قرآن نے کلمہ کہا اور مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اللہ کی صفت کلام قدیم ہے ۔ اس لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی قدیم ہیں، مامون کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی اس کے دربار میں بعض معتزلی علما مثلاً احمد بن داؤد وغیرہ نے مامون کو متاثر کر لیا تھا اس لیے اس کی طرف سے حکم دے دیا گیا کہ جو شخص قرآن کو مخلوق نہیں مانتا اس کو ماننے پر مجبور کیا جائے اس کے بعد علما نے توحید کی تشریح میں اس کی صفات کو قدیم ماننا بھی توحید کا جز قرار دیا اس طرح قرآن کو بھی مخلوق ماننا عقیدے میں شامل کر دیا ۔

عرض یہ ہے کہ جہاں تک ماورائے عقل مسائل میں عقلی اور مشاہداتی دلائل کے استعمال کا تعلق ہے قرآن نے بھی اس سے کام لیا ہے لیکن ایک "فلسفیانہ علم کلام" اسی وقت کی پیداوار ہے جب بہت سے انسانی فلسفوں سے اہل اسلام سابقہ پڑا اس کے بعد سے ہر زمانے میں ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں جنھوں نے ان نئے فلسفیانہ اور مادی علوم کے پیدا شدہ تشکیکات اور اعتراضات کا جواب دینے کی کوششیں کیں اور مثبت طور پر اسلامی عقائد اور شریعت اسلامی کی حقانیت کو ذہن نشین کراتے رہے، کسی زمانے میں یہ خدمت امام غزالی، امام رازی اور ابن رشد نے انجام دی اور کسی زمانے میں عزالدین ابن عبدالسلام ابن مسکویہ اور مولانا روم نے یہ خدمت اپنے ذمے لی اور کسی زمانے میں امام ابن تیمیہ نے اپنی ساری صلاحیتیں اسی میں لگادیں امام ابن تیمیہ نے تو کتاب الرد علی المنطقین میں سارے یونانی منطق و فلسفے کے معروضات کو ہی الٹ کر رکھ دیا اور پھر مثبت طرز استدلال کو عین فطری استدلال قرار دیکر دلائل سے ثابت کیا: ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علم کلام ہندوستان میں

ہندوستان میں بھی یہ فلسفیانہ علم کلام پہنچا اور یہاں بھی لکھنے پڑھنے کا سلسلہ برابر جاری رہا خاص طور پر مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ کے بعد سے ہندوستان میں اسلام کی جو نشاۃ ثانیہ ہوئی اس کے بعد سے برابر ایسے علما پیدا ہوتے رہے جو اپنے اپنے زمانے کے لحاظ سے علم کلام کو نئی زندگی بخشتے رہے شاہ ولی اللہ رح نے براہ راست علم کلام پر کوئی کتاب نہیں لکھی مگر ان کی حجۃ اللہ البالغہ مثبت علم کلام کی بہترین مثال ہے بیسویں صدی کے شروع میں علامہ شبلی نعمانی ؒ نے ایک نئے علم کلام کی ضرورت کو سب سے پہلے محسوس کیا اور خود اس موضوع پر دو کتابیں لکھیں اور ندوہ کے مقاصد میں اسے داخل کرایا ان کے بعد جسٹس امیر علی سید سلیمان ندوی، مولانا ابو الاعلیٰ مودودی، اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی، اور مولانا عبد الباری مولانا ابو الکلام آزاد اور پھر ڈاکٹر اقبال نے اس سلسلے میں ایک بیش قیمت اور ایک نیا علم کلام دنیا کے سامنے پیش کیا خاص طور پر مولانا عبد الباری ندوی نے موجودہ فلسفہ و سائینس کی روشنی میں اسلامی عقائد کی حقانیت جس طرح ثابت کی ہے اس سے کوئی ماڈرن سے ماڈرن آدمی بھی انکار کی جرأت نہیں کر سکتا اسی طرح جسٹس امیر علی نے یورپ میں بیٹھ کر اسلام کی اس حیثیت سے بڑی بیش بہا خدمات انجام دیں اس وقت بھی ہمارے ایک ابھرتے ہوئے مفکر وحید الدین خان یہ خدمت انجام دے رہے ہیں، ان کی کتاب "علم جدید کا چیلنج" اس موضوع پر بہترین کتاب ہے جس کے اردو اور عربی کے ایک درجن ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں یہ کتاب جلد سے جلد انگریزی میں بھی منتقل ہو جاتی تو بڑا مفید کام انجام پاتا۔ سر سید اور مولوی چراغ علی نے بھی اس سلسلے میں اپنی کوششیں صرف کی ہیں مگر ان کی کوششیں اپنی داخلی کمزوریوں کی وجہ سے زیادہ کامیاب نہ ہو سکیں اوپر ہم اس کی طرف اشارہ کر آئے ہیں،

موجودہ دور میں ایک نئے علم کلام کی ضرورت ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہے مگر اصل سوال یہ ہے کہ اس کا دائرہ کار کیا ہوگا اس میں کئی رائیں ہو سکتی ہیں راقم الحروف کے نزدیک اس نئے علم کلام کے لئے سب سے ضروری بات یہ ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ وہ اسلامی عقائد کی ایسی صاف ستھری تعبیر کرے جس سے انسانی زندگی کے مادّی وجود کا تعلق اس کے روحانی وجود سے جڑا ہوا معلوم ہو خیالات اور تصورات کے اعتبار سے انسانی کا وجود اپنی ذات سے متصادم نہ ہو اس کا مادّی وجود اپنے روحانی وجود یا باطنی صلاحیتوں سے منقطع نہ ہو کائنات کی وہ ایسی توجیہہ کرتا ہو کہ اس کا تعلق انسانی زندگی سے ٹوٹنے نہ پائے انسانی وجود کی ایسی توجیہہ پیش کرتا ہو جس میں اس کے آغاز وانجام کی پُرمسرت جھلک نظر آتی ہو اور اس کی ذہنی سرگرمیوں کے لیئے ایسا میدان ملنا چاہیے جہاں پہنچ کر نہ تو ہکسلے کی طرح اظہار تاسف کرنا پڑے نہ جے ڈبلو سولیوں کی طرح حیرت زدہ ہو کر یہ لکھنا پڑے کہ

"سائنسی نظریات کے جائزے سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ایک صحیح سائنسی نظریہ محض یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ ایک عملی مفروضہ ہے"

یہ بہت ممکن ہے کہ تمام سائنسی نظریات اصلاً غلط ہوں، جن نظریات کو ہم تسلیم کرتے ہیں وہ ہمارے موجودہ مشاہدے کے اعتبار سے حقیقتیں حقیقت اب بھی سائنس کی دنیا میں ایک علمی اور افادی مسئلہ ہے

علم کلام کے دائرے میں زندگی کے وہ تمام مسائل آنا چاہئیں جو جدید معاشرے یا موجودہ دور کی جدید تحقیقات کے واسطے سے پیدا ہوئے ہیں اور یہ علم کلام ہمیں اُن کا تشفی بخش جواب دے سکے اسی کے ساتھ یہ بات بھی ضروری ہے کہ اوپر جن چار محرکات کا ذکر کیا گیا ہے ان کا دباؤ ہمارے ذہن پر نہ ہو اور علم کلام کی ضرورت اور اُس کی بنیادی قدروں اور معقول پسندانہ دلائل کو ہم کھلے دل سے قبول کریں اور اس سے راہِ فرار اختیار نہ کریں۔

قدیم اور جدید عصبیت

عام طور پر جدید تعلیم یافتہ حضرات کسی نئی فکری تحریک کی ناکامی کی ذمّے داری قدامت پرست علماء کے سر ڈال دیتے ہیں جیسا کہ دعوت نامے کے الفاظ سے بھی ظاہر ہوتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر علمائے اسلام کے سلسلے میں مثبت قدامت پرستی، تنگ نظری اور عصبیت میں مبتلا ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تو جدید تعلیم یافتہ طبقے میں بھی اس کے سلسلے میں ایک دوسری طرح کی منفی عصبیت موجود ہے بہت سی قدیم مذہبی قدریں موجودہ دور کی سائنسی تحقیقات کی روشنی میں ایک ثابت شدہ حقیقت بن چکی ہیں۔ مگر اس طبقے نے اپنا جو ذہنی سانچہ بنالیا ہے اس فریم میں یہ حقیقت چوں کہ فٹ نہیں ہوتی اس لئے اکثر افراد غور کیئے بغیر ان کا انکار کر دیتے ہیں یا ان سے کترانے کی کوشش کرتے ہیں ہم یہ بات کسی مفروضے کے تحت نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ مغربی مفکرین نے خود اس " جدید ذہن " کی منفی عصبیت کا اعتراف کیا ہے۔ جیمز نے اپنی کتاب " پراسرار کائنات " کے آخر میں لکھا ہے

> ہمارے جدید ذہن واقعات کے مادی توجیہ کے حق میں ایک طرح کا تعصب رکھتے ہیں

اسی طرح وٹلکر چیمبرز نے اپنی کتاب " شہادت " (Witness) میں اپنا ایک واقعہ ذکر کیا ہے وہ اپنی بچی کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اس کی نظر بچی کے کان پر جا پڑی اور غیر شعوری طور پر وہ اس کی ساخت کی طرف متوجہ ہوگیا اس نے اپنی جی میں سوچا کہ اتنی غیر ممکن بات ہے کہ ایسی پیچیدہ اور نازک چیز محض اتفاق سے وجود میں آجائے یقیناً یہ پہلے سے سوچے سمجھے نقشے کے تحت ہی ممکن ہے مگر اس نے جلدی اس خیال کو اپنے ذہن سے نکال دیا کیونکہ اسے احساس ہوا کہ اگر وہ ایک منصوبے کو مان لے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہوگا کہ اسے منصوبہ ساز (یعنی خدا) کو ماننا ہوگا اور یہ ایک ایسا تصور تھا جسے اس کا ذہن قبول کرنے کے لیئے تیار نہیں تھا۔ اس واقعہ کو ذکر ہوئے ٹامس ڈیوڈ پارکس نے لکھا ہے۔

> میں اپنے پروفیسروں اور ریسرچ کے سلسلے میں اپنے رفقا کار میں بہت سے سائنسدانوں کے بارے میں جانتا ہوں کہ علم کیمیا اور علم طبیعیات کے مطالعے اور تجربے کے دوران انھیں متعدد بار اس طرح کے احساسات سے دوچار ہونا پڑا ہے۔

جو لوگ اس طرح کے تعصبات میں مبتلا ہوتے ہیں وہ انتہائی کھلے ہوئے واقعات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے بھی سبق نہیں لیتے ایک امریکی عالم طبعیات دی۔ ایچ بلنٹ کے الفاظ میں اس تعصب کی ایک خاص وجہ ہے اس کے الفاظ یہ ہیں

خدا پرستی معقولیت اور انکار خدا کا پھسپھسا پن بجائے خود آدمی کے لیئے عملاً خدا پرستی اختیار کرنے سبب نہیں بن سکتا لوگوں کے دلوں میں یہ شبہہ چھپا ہوا ہے کہ خدا کے ماننے کے بعد آزادی کا خاتمہ ہو جائے گا وہ لوگ جو ذہنی آزادی کو دل وجان سے پسند کرتے ہیں آزادی کی محدودیت کا کوئی تصور ان کے لئے وحشت ناک ہے۔

قرآن پاک نے ایسی ہی ذہنی عصبیت میں گرفتار لوگوں کے لئے کہا ہے وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ۔ازمین وآسمان میں کتنی نشانیاں ہیں جنھیں یہ لوگ دیکھتے ہوئے گذر جاتے ہیں اور ذرا غور نہیں کرتے جب تک ذہنی تعصب کی یہ دیواریں گریں گی نہیں اس وقت تک بڑی حقیقت بھی آدمی کو اپنا وجود تسلیم نہیں کرا سکتی ۔اس لئے میں جدید تعلیم یافتہ مستغربین دوستوں سے یہ عرض کروں گا کہ مولویوں کی قدامت پرستی پر نظر ڈالتے ہوئے اپنے ذہنی سانچے کا بھی جائزہ لیتے رہیے کہ کہیں ہم خود تو اس جدید عصبیت میں مبتلا نہیں ہیں۔

راقم الحروف کے خیال میں موجودہ دور میں دو طرح کے علم کلام کی ضرورت ہے۔ ایک علم کلام الزامی یا جدلیاتی ہونا چاہیے اور دوسرا علم کلام مثبت طور پر ان اسلامی حقائق کی صاف ستھری تعبیر کرے جو عام پر ہمارے مشاہدے سے بالا تر ہوتے ہیں پہلا علم کلام تشکیکی ذہن والوں کے لیئے ہوگا دوسرا یقین میں اضافہ کرنے کے لیے ان دونوں موضوع پر اس سے پہلے متعدد علماء نے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے بہت کچھ کام کیا ہے مگر اب بھی اس موضوع پر بہت کام باقی ہے مجھے علم نہیں کہ جدید تعلیم یافتہ حضرات نے اس سلسلے میں کوئی انجام دیا ہے یا نہیں ایک مدت پہلے مظہر الدین صدیقی اور ڈاکٹر رفیع الدین صاحب کی کتابیں پڑھی تھیں جو اس سلسلے کی قابل قدر کتابیں ہیں۔

ہم جسے پرانا علم کلام کہتے ہیں وہ اپنے زمانے کے لحاظ سے بالکل نیا تھا وہ بھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھی مسلمان قوم پر بوجھ ثابت نہیں ہوا زمانے کے حالات اور مسائل کے لحاظ سے علم کلام میں برابر اضافہ ہوتا رہا اور اس کا انداز بدلتا رہا دو صدی پہلے کا علم کلام آج بھی بوجھ نہیں ہے بلکہ وہ ہمارے ماضی کا ورثہ اور ہماری فکرو ذہنی سرگرمیوں کی ایک زندہ تاریخ ہے اگر ہم اسے داستانِ پارینہ یا بوجھ سمجھ کر اس سے اپنا پیچھا چھڑائیں گے تو نئے علم کلام پر ہم کوئی قابلِ قدر کام انجام نہیں دے سکیں گے۔ اس لیے انداز تو ضرور بدلتا ہے مگر انسان کا جو فکری ذہنی سانچہ ہے وہ بار بار نہیں بدلتا بلکہ غیر مشاہد حقائق کے بارے میں جو شکوک و شبہات بیسویں صدی میں پیدا ہوئے ہیں وہ دو ہزار سال پہلے بھی انسان کے ایک گروہ کے ذہن میں پیدا ہوتے رہے ہیں۔ بس طریقہ اظہار بدلتا رہا، کبھی اس کا اظہار غیر متمدن انداز میں ہوتا تھا اور اس وقت اسے علم و فن کی ملمع سازی کر کے پیش کیا جا رہا ہے۔

شریعت اسلامی میں اجتہاد | دعوت نامے کے عنوان کا آخری ٹکڑا ہے شریعت اسلامی کی نئی تعبیر جس میں میں نے تھوڑی سی تبدیلی کر دی ہے یعنی شریعتِ اسلامی میں اجتہاد کی ضرورت ہے

مغربی ملکوں کی سیاسی گرفت سے بیس پچیس برس کے اندر جو اسلامی ملک آزاد ہوئے ہیں ان کے لئے یہ مسئلہ بڑی سنجیدگی سے زیرِ غور ہے کہ ملک کا آئندہ دستور کیا ہو جن اسلامی ملکوں نے اپنا ہنٹ اپ سیکولر بنا لیا ہے ان کے سامنے تو صرف مسلم پرسنل لا کا مسئلہ ہے لیکن جن ملکوں میں پورے اسلامی دستور کے نفاذ کی کوئی مؤثر تحریک موجود ہے یا جہاں کا برسرِ اقتدار طبقہ اسلام سے گہرا روایتی تعلق رکھتا ہے وہاں یہ سوال بڑی سنجیدگی سے درپیش ہے کہ جن سیاسی معاشی اور معاشرتی مسائل میں کتاب و سنت کی صریح ہدایات موجود ہیں ان کو من و عن تسلیم کر لیا جائے یا مصلحت و حالات کے اعتبار سے ان میں ترمیم یا اضافہ یا تخصیص پیدا کی جائے۔

جدید و قدیم تعلیم یافتہ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ یہ کہتا ہے کہ کتاب و سنت کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تمام احکام لابدی اور دائمی ہیں ان میں کسی ترمیم و اضافے کی قطعی گنجائش نہیں ہے
اسلامی دستور کے نفاذ کے معنی یہ ہیں کہ اسلام نے عقائد عبادات اور اخلاق کی
طرح سیاست، معاشرت اور معاشیات کے سلسلے میں حرام و حلال کی حدیں مقرر کر دی ہیں ان سے باہر قدم نہ نکالا جائے اور
اگر حالات ان حدود کا ساتھ نہ دیں تو اسلامی احکام کو حالات کے موافق بنانے کے بجائے خود حالات و ماحول کو ان کے
موافق بنانے کی کوشش کی جائے۔ جہاں بالکل مجبوری پیش آجائے وہاں اجتہاد سے کام لیا جائے۔

اس کے برخلاف تعلیم یافتہ مسلمانوں کا ایک چھوٹا سا طبقہ جس میں زیادہ تر جدید تعلیم
یافتہ اور کچھ روشن خیال علماء شامل ہیں (اوپر ان میں کچھ اشخاص اور اداروں کا نام آچکا
ہے) یہ کہتا ہے کہ اسلام نے سیاست، معیشت اور معاشرت میں جو حدیں مقرر کی ہیں
اور صریح احکام دیے ہیں انکو حالات اور ماحول کے تقاضے کے تحت بدلا اور توڑا
جاسکتا ہے اس لیے کہ سیاسات معیشت اور معاشرت کے مسائل میں ہمیشہ ارتقاء ہوتا رہتا
ہے اس لیئے اس ارتقا کا ساتھ دینا ضروری ہے ورنہ اسلامی ممالک معاشی، معاشرتی
اور سیاسی بدحالی میں مبتلا ہو جائیں گے اور ظاہر ہے کہ یہ بات اسلامی دستور کی روح کے
منافی ہے، اس حلقے میں کچھ لوگ تو واقعی اخلاص سے یہی رائے رکھتے ہیں، مگر ان میں بیشتر
یا تو مغربی نظام کی مرعوبیت کی بنا پر ایسا کہتے ہیں یا پھر اپنی کم علمی اور آزاد روی کیوجہ سے
ایسا چاہتے ہیں یہ حلقہ اپنی رائے کو مدلل بنانے اور قوی ثابت کرنے کے لئے قرآن وحدیث
اور فقہ کی کتابوں سے کچھ دلائل بھی پیش کرتا ہے اور خلفائے راشدین کے بعض ان
فیصلوں کو بھی پیش کرتا ہے جو ان کی دانست میں کتاب وسنت کے صریح احکام کے
خلاف ہیں۔

اس بات میں تو مسلمانوں کے کسی گروہ کو اختلاف نہیں ہے کہ موجودہ دور میں جس
ملک میں بھی اسلامی دستور نافذ ہوگا وہاں نظام سیاست و معیشت کا ڈھانچہ
بدل دینے کے بعد کچھ ایسے معاشی اور تمدنی مسائل ضرور باقی رہیں گے جن کو فوراً بدل دینے
میں یا تو نظام حکومت میں خلل پڑے گا یا کم از کم ان کے بدلنے میں دیر لگے گی، ظاہر
ہے کہ ان میں سے جو بھی صورت ہو گی ان مسائل میں اسلامی دستور کے نافذین

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو اجتہاد سے کام لینا پڑے گا اس طرح موجودہ نظام جمہوریت میں بہت سے معاشی مسائل کا جو حل سوچا گیا ہے اور جس پر عمل درآمد بھی ہو رہا ہے ان میں اگر تھوڑی سی بھی تبدیلی کر کے ان کو حلال و حرام کی قید کا پابند کر دیا جائے تو اسلامی نظام معیشت کے موافق بنایا جا سکتا ہے مثال کے طور جمہوری ملکوں کے مزدوروں کے حقوق و تحفظ کے قانون میں اگر تھوڑی سی تبدیلی کر دی جائے تو ان کو اسلامی قانون اُجرت کے مطابق بنایا جا سکتا ہے لیکن سودی تجارت فارن ایکسچینج بینکنگ وغیرہ اور اس سے بڑھ کر انفرادی اور اجتماعی ملکیت اور آزادی کے سلسلے میں حکومت کے دائرہ اختیار کے تعین میں بھی اجتہاد کی ضرورت ضرور پیش آئے گی۔

مثال کے طور پر موجودہ دور میں رسل و رسائل کے سارے ذرائع حکومت کے ہاتھ میں ہوتے ہیں خواہ وہ حکومت جمہوری ہو یا اشتراکی یا شخصی۔ اب اگر کہیں اسلامی دستور نافذ ہوتا ہے تو اسلامی حکومت کو اس پر غور کرنا ہوگا کہ اسلامی تشریحات اور عہد نبوی اور عہد صحابہؓ کے تعامل کے پیش نظر رسل و رسائل کے ذرائع کو افراد کے ہاتھوں میں دے دیا جائے یا قومی ملکیت میں رہنے دیا جائے اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ امریکہ میں بھی کچھ سال پہلے بس ٹرانسپورٹ کا جتنا حصّہ حکومت کے اختیار میں تھا وہ بھی انفرادی ملکیت میں دے دیا گیا ہے اور ہر سال اس طرح کچھ نہ کچھ چیزیں حکومت کے ہاتھوں سے نکال کر انفرادی ملکیت میں دے دی جاتی ہیں چنانچہ امریکہ کی بڑی بڑی صنعتیں حکومت کے بجائے افراد کے ہاتھ میں ہیں اور ملک کی معیشت پر اس کا کوئی بُرا اثر نہیں پڑتا اور اگر پڑتا ہے تو اس کی تلافی کی صورتیں بھی ہیں۔

میرے خیال میں اس بارے میں پہلے گروہ کو بھی کوئی اختلاف نہ ہوگا کہ بنیادی ضروریات پیدا کرنے والے ذرائع اور عوامل کو کم از کم موجودہ حالت میں مستقلاً یا کچھ دن تک حکومت کے قانونی ہاتھوں ہی میں رہنا چاہیے، جس کی گنجائش کتاب و سنت میں موجود ہے۔ اصل اختلاف یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ موجودہ نظام میں جو چیزیں صراحتہً اسلامی تعلیم کے خلاف ہیں مثلاً موجودہ تجارت میں سود سٹے بازی، ذخیرہ اندوزی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مستقبل کے سودے یا سودی بینکنگ، فیملی پلاننگ اور شادی پر پابندی وغیرہ یا سیاسی مسائل میں طریقۂ انتخاب، عورتوں اور مسلموں کی نظام حکومت میں شرکت یا معاشرتی مسائل میں نکاح وطلاق کے سلسلے میں حکومت کی مداخلت وغیرہ یہ اور اس طرح کے اور بہت سے مسائل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کو یوں کا توں باقی رہنے دیا جائے اور جو اسلامی احکام ان کے خلاف پڑتے ہیں ان میں تبدیلی کردی جائے یا یہ کہ ان مسائل کی صورت ہی آہستہ آہستہ بدلنے کی کوشش کی جائے اور جہاں غیر معمولی حرج واقع ہوتا ہو ان کی جس حد تک ممکن ہو اسلامی روح سے قریب لاکر کچھ دنوں تک اسی حال پر چھوڑ دیا جائے اور جب تجربے سے یہ بات واضح ہوجائے کہ انکو اسلامی روح کے بالکل مطابق کردینے میں معاشی یا معاشرتی فساد رونما ہونے کے بجائے اجتماعی صلاح پیدا ہوگی تو ان کو بدل دیا جائے ورنہ جوں کا توں رہنے دیا جائے۔

مثال کے طور پر یہ مسئلہ کہ ایک مرد بیک وقت متعدد عورتوں کو اپنے حبالۂ عقد میں لاسکتا ہے یا نہیں مردوں کی طرح عورتوں کو بھی طلاق کا حق دیا جائے یا نہیں جیسا کہ اس وقت پاکستانی پارلیمنٹ میں مسئلہ درپیش ہے یا عورتوں کو مردوں کے دوش بدوش اسمبلیوں میں نمائندگی دی جائے یا نہیں اس بارے میں دوسرا گروہ کہتا ہے کہ قانوناً ایک مرد کو بیک وقت دو یا دو سے زیادہ عورتوں سے نکاح کرنا ممنوع قرار دیا جائے، عورتوں کو مردوں کے مساوی حقوق کا تقاضہ ہے کہ عورتوں کو بھی طلاق کا حق دیا جائے اس طرح بغیر کسی قید کے مردوں کی طرح عورتوں کو بھی آبادی کے تناسب سے دستور ساز اسمبلیوں پارلیمنٹوں اور دفتروں میں نمائندگی دی جائے کیوں کہ مصلحت اور موجودہ تمدن کا بھی اقتضا ہے اس کے برخلاف پہلا گروہ یہ کہتا ہے کہ اس بارے میں اسلامی احکام کو پس پشت ڈالنے اور اس میں بے وجہ اجتہاد کرنے اور قانون بنانے کی قطعی ضرورت نہیں ہے اس کے بغیر نہ تو معاشرت میں کوئی خلل واقع ہوتا ہے اور نہ سیاست میں، بلکہ جن ممالک میں عورتوں کو نمائندگی دی گئی وہاں بھی مساوات کی بنیاد پر نہیں بلکہ غیر معمولی اہلیت کی بنا پر نمائندگی دی گئی ہے یا جن ممالک میں ایک سے زائد شادی پر پابندی لگائی گئی ہے، ان ممالک میں جنسی جرائم اور معاشرتی تباہ حالی اور خاندانی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انتشار کے واقعات اتنے زیادہ ہوگئے ہیں کہ خود وہاں کی حکومتیں اب اپنے معاشرتی قانون پر نظر ثانی کر رہی ہیں اس طرح مردوں اور عورتوں کو مساوی حقوق دینے میں خاندان کے نظام میں بڑی خرابیاں پیدا ہوں گی اور اسلامی معاشرہ جسکی بنیاد خاندان کے وجود اور اس کی صلاح پر ہے اس کے نزدیک قانونی اور اخلاقی دونوں اعتبار سے یہ پابندی صحیح نہیں ہے اور تجربہ بھی بتاتا ہے کہ جن ملکوں میں یہ حق دیا گیا ہے وہاں خاندانی نظام درہم برہم ہو کر رہ گیا ہے اور بہت سے اخلاقی مفاسد پیدا ہو گئے ہیں اور محبت و مروت کی ساری قیدیں نفسانی تسکین تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں قرآن نے مرد کو قوام یعنی خاندان کا ذمے دار قرار دیا ہے۔ اس میں تبدیلی سے نہ تو معاشرے کو کوئی فائدہ ہوگا اور نہ اس سے دوسرا کوئی متعین فائدہ سامنے آئے گا سوائے اس کے کہ مساوات کے لفظ میں ایک جذباتی تسکین ضرور محسوس ہوتی ہے پھر کبھی دوسری شادی کسی مجبوری کی وجہ سے بھی کرنی ضروری ہوتی ہے اس لیے ان صورتوں کو مستثنیٰ کر کے " عدل بین الازواج " کے تحت حکومت قانون بنانے کی یقیناً مجاز ہے
غرض یہ کہ اختلاف اس بات میں نہیں ہے کہ شریعت میں اجتہاد کی گنجائش ہے یا نہیں بلکہ اختلاف اس دائرہ اختیار اور معاشرے کی سیاسی و معاشی فلاح کے حدود کی تعیین میں ہے۔

مسلمانوں کی دو حیثیتیں

ہر زمانے کی طرح اس زمانے میں بھی مسلمانوں کی دو حیثیتیں ہیں ایک جہاں وہ تنہا دستور سازی کی پوزیشن میں ہیں۔ دوسرے جہاں وہ تنہا دستور سازی کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔

اجتہاد کے سلسلے میں جہاں اس کے لیے قیاس استحسان مصالح مرسلہ اور استصلاح کا استعمال کر کے فلاح عامہ کے مسائل طے کیے جا سکتے ہیں وہیں عرف و عادت اور عموم بلویٰ کا استعمال بھی بڑی مدد پہنچاتا ہے عموم بلویٰ کا مطلب یہ ہے کہ کوئی حرام یا مکروہ کام جس کا ارتکاب یا استعمال اتنا عام ہوگیا ہو یا حکومت ایسا قانون بنا دے کہ اس سے بچنا بالکل دشوار ہو جائے خاص طور پر جن ملکوں میں مسلمان دستور سازی کی پوزیشن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں نہیں ہیں وہاں نفیِ حرج والے احکام، عرف اور عموم بلوی کے قاعدے کا استعمال ان کو بہت سی آسانیاں بہم پہنچا سکتا ہے ہمیں اجتہاد کرتے وقت مسلمانوں کی ان دونوں حیثیتوں کو سامنے رکھنا ضروری ہوگا

جس ملک میں مسلمان دستور سازی کی پوزیشن میں ہیں وہاں انکو بین الاقوامی معاملات کے علاوہ کم ہی عموم بلوی کا سہارا لینے کی ضرورت پڑے گی بشرطیکہ ان کا ذہن اسلام کے بارے میں صاف ہو اس کو آپ تعجب خیز بات نہ سمجھیں کمیونسٹ ملکوں میں اور خاص طور پر روس اور چین میں اور اندرون ملک سودی بینکنگ سسٹم کا کوئی وجود نہیں ہے۔ البتہ بین الاقوامی سطح پر ان کو اس حمام میں ضرور آنا پڑتا ہے ضروت اصل میں ذہنی تبدیلی کی ہے۔ البتہ جہاں مسلمان دستور سازی کی پوزیشن میں نہیں ہیں وہاں مسلمانوں کے اندر چاہے کتنا ہی زندہ دینی شعور اور قوتِ مقاومت موجود ہو مگر ان کو بہت سی معاشی ومعاشرتی اور سیاسی دقتوں اور قانونی مجبوریوں کی بنا پر نفیِ حرج، عموم بلوی اور فساد زمانے کی پناہ گاہ کا سہارا لینا پڑے گا اس بات کو چاہے ہمارا پُر عزیمت دینی ذہن قبول نہ کرے مگر عملی زندگی میں ہمیں اس سے دوچار ہونا پڑتا ہے البتہ اس بارے میں دو رائے ہو سکتے ہیں کہ عموم بلوی اور حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے جن معاملات میں حرام وحلال کی قیدوں کو باقی نہ رکھ سکیں یا کسی مکروہ کام پر مجبور ہوں تو ان کا ارتکاب یا استعمال ذہنی طور پر ہم جائز سمجھ کر کریں یا ان کو حرام یا ناجائز سمجھتے ہوئے ان کو قبول کریں،

راقم الحروف کے نزدیک دوسری صورت اسلام کی روح سے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے اور قرآن وحدیث کی صراحت بھی اس ذہنیت کا ساتھ دیتی ہے مثلاً قرآن میں ہے إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ اس صورت میں وہ گناہ سے بچ جائے گا اور اجر وثواب کا بھی مستحق ہوگا دوسری جگہ ہے فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ میرا استدلال لفظ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ پر ہے اور پھر قوموں کی زندگی کے لئے ایسا کرنا بسا اوقات ضروری ہوتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت سات آٹھ سو برس رہی اس پوری مدت میں ہندو قوم کے ایک بڑے طبقے کے مردوں نے فارسی زبان سیکھی اور اس کی تہذیب سے بھی متاثر ہوئے اور اس زبان کے سیکھنے کے جتنے فوائد تھے وہ سب انھوں نے اٹھائے مگر انھیں افراد نے اپنے گھروں کے اندر فارسی زبان و تہذیب کی ہوا تک نہیں لگنے دی اور اس طرح اتنی طویل مدت تک اپنی تہذیبی خصوصیات محفوظ کرنے میں وہ کامیاب ہوئے ہم اس ذہنیت کو قدامت پرستی کہہ سکتے ہیں مگر یہ بات ہے بہت ہی قابل تعریف اور ہندوستان کی تاریخ میں اس کا ذکر ایک یادگار واقعہ کے طور پر کیا جائے گا اس لئے راقم الحروف کے نزدیک ہم کو اسی ذہنیت کے ساتھ ان کا ارتکاب یا استعمال کرنا چاہیے، اس لیے کہ اس صورت میں اس بات کا امکان باقی رہتا ہے کہ برادران وطن کے ذہن میں یہ بات ہم کسی وقت بٹھا سکیں یا خود ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جائے کہ بہت سے معاملات میں ہم جو جدید تہذیب کی پیروی کر رہے ہیں وہ ہماری قدیم خصوصیات کے لیئے مہلک ہے اس لیئے ہمیں اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہیئے اور اگر ہم پہلی صورت اختیار کرتے ہیں تو یہ امکان ہمیشہ کے لیئے ختم ہو جائے گا

اب اس سلسلے کی آخری بات کہہ کر میں اپنی بات ختم کروں گا وہ کہ شریعت اسلام میں اجتہاد کی ضرورت پیش آجائے تو اجتہاد کرنے کا حق کن لوگوں کو حاصل ہوگا یا نہ ہوگا عام طور پر جن کو علماء کہا جاتا ہے یہ حق صرف انھیں کو ہے یا یہ حق اس جدید تعلیم یافتہ طبقے کو بھی پہنچتا ہے جو کم از کم متوسط علم دین کے ساتھ اسلام کی بنیادی قدروں کا قائل ہو اور اس پر براہ راست حکومت کا دباؤ نہ ہو راقم الحروف کے نزدیک جدید مسائل میں اجتہاد کے لیے دونوں طبقوں کی ضرورت ہے البتہ اس میں کام کی حدیں ضرور مقرر کرنی ہوں گی دونوں طبقوں کی حدیں کیا ہونی چاہیں اس کو میں دو ایک مثالوں سے واضح کرنے کی کوشش کروں گا

امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے بارے میں یہ بات معلوم ہے کہ قرآن و حدیث سے اُنھوں نے جتنے مسائل خاص طور پر معاملات کے سلسلے میں مستنبط کئے دوسرے فقہاء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے اتنے مسائل مستنبط نہیں کئے تو اس کی ایک وجہ تو تذکرہ نگار یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ خود ایک بڑے تاجر تھے اس لئے وہ معاملات اور معاملات میں حالات کے لحاظ سے جو ردّ و بدل ہوتے رہتے ہیں اس لئے وہ براہ راست واقف تھے دوسری وجہ یہ تھی کہ ان کا استنباط شورائی ہوتا تھا جب کوئی نیا مسئلہ یا کوئی نئی صورت پیش آتی تھی تو وہ اسے اپنی مجلس میں تلامذہ کے سامنے پیش کرتے تھے اور سارے تلامذہ اس کے بارے میں دلائل اور رائے دیتے تھے پھر بحث و مباحثے کے بعد امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ علیہ اپنا فیصلہ دیتے تھے اسی طرح ان کے شاگرد امام ابو یوسف کی رائے عدلیہ کے سلسلے میں زیادہ وزنی سمجھی جاتی ہے اس لئے کہ وہ خود خلافت عباسیہ میں قاضی القضاۃ یعنی چیف جسٹس رہ چکے تھے امام صاحب کے دوسرے شاگرد امام محمد کے بارے میں تذکروں میں آتا ہے کہ وہ جب بازار اور پیشہ وروں کے معاملات کے بارے میں کوئی مسئلہ مستنبط کرتے تھے تو پہلے بازار جا کر اس پیشے یا معاملے سے متعلق افراد سے مل کر اس کے ردّ و بدل اور عرف رواج کو معلوم کرتے تھے پھر اس سلسلے میں اپنی کوئی شرعی رائے دیتے تھے آج بھی ضرورت ایک ایسی ہی ٹیم کی ہے جس میں دونوں طرح کے لوگ شریک ہوں میں معذرت کے ساتھ یہ عرض کروں گا کہ اگر ہمارے جدید تعلیم یافتہ حضرات اپنی حدیں مقرر کر لیں کہ وہ زندگی کے عرف و عادات حالات کی ناسازگاری اور عموم بلوٰی قسم کی پیچیدہ سیاسی، معاشی معلومات فراہم کر کے مجلس میں پیش کریں اور علماء بحث و مباحثے کے بعد اس سلسلے میں اپنی شرعی رائے دیں تو اس طرح آسانی سے کسی مسئلے میں اجتہاد کی صورت پیدا ہو جائے گی مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ دونوں طبقے اپنے احساس برتری کو بالائے طاق رکھ دیں اگر یہ حد مقرر نہیں ہوگی تو دونوں اپنی جگہ پر فتوے دیتے رہیں گے اور قوم ذہنی انتشار کا شکار ہوتی رہے گی۔

© rasailojaraid.com